© rasailojaraid.com

فکر و نظر ---- اسلام آباد جلد:۴۰ شمارہ:۱

اقبال کا تصورِ عمل اور دُعا

طالب حسین سیال ☆

سید نذیر نیازی اپنی کتاب بعنوان ''اقبال کے حضور'' میں ۱۷ مارچ ۱۹۳۸ء کے دن کی روئیداد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت علامہ اپنی علالت پر تبصرہ کرنے لگے ....عوارض سے علاج اور علاج سے سلسلہ گفتگو دوا کی طرف پھر گیا اور دوا سے دعا کی طرف۔ حضرت علامہ نے فرمایا ''دُعا کے بارے میں سر سید احمد خان اور مرزا صاحب (بانی سلسلۂ احمدیہ) نے انتہا کر دی۔ سید احمد خان پر تو علت و معلول کا خیال اِس درجہ غالب تھا کہ اُس وقت کے علوم طبعی کے زیرِ اثر اُنہوں نے ''نیچر'' کا جو تصور قائم کیا اُس کی رو سے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ حوادث کی ترتیب میں کوئی رد و بدل ہو سکے یا اُن سے وہ نتیجہ مترتب نہ ہو جس کا باعتبار علت و معلول مترتب ہونا ضروری ہے لہٰذا وہ بار بار ''نیچر'' کا نام لیتے اور پھر اس کے اس حد تک قائل ہوگئے کہ اُنہوں نے سمجھا کائنات کے جملہ حوادث علت و معلول کی کڑی زنجیر میں اس سختی سے منسلک ہیں کہ ایک کے بعد دوسرے کا ظہور یقینی ہے۔ اب فرض کیجئے حادثہ الف رونما ہے اور یہ حادثہ کسی دوسرے مثلاً حادثہ ب کی علت ہے تو بحیثیت معلول حادثہ ب کا ظہور گویا پہلے سے متعین ہو چکا ہے، لہٰذا حادثہ وقوع میں آئے گا اور ضرور آئے گا۔ یہ ''نیچر'' ہے اور نیچر کی کارفرمائی رک سکتی ہے نہ اسے کوئی روک سکتا ہے ''نیچر اپنا کام کرتا رہے گا۔ حوادث کی ترتیب علت و معلول کی پابند ہے اور اس میں رد و بدل ناممکن۔ یہ گویا امر ربی ہے۔ یوں سرسید کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ دعا سے بجز تسکینِ قلب اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ دوسری طرف مرزا صاحب تھے، جن کا کہنا تھا کہ دعا سے سب کچھ ممکن ہے۔ آپ دعا کرتے جایئے، جو چاہتے ہیں ہو جائے گا۔ حالانکہ ایک بڑا مسئلہ اس سلسلے میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کسی حادثے کی توجیہہ یہ سمجھ کر کر لی جاتی ہے کہ وہ نتیجہ ہے قبولیت دعا کا تو ہمارے پاس اس کا ثبوت کیا ہوگا۔ یہ کیسے معلوم ہو کہ دعا کی جاتی تو یہ حادثہ پیش نہ آتا۔ معترض کہہ سکتا ہے کہ اسے بہرکیف پیش آنا تھا، اس لئے کہ حوادث ماقبل کا رخ اُسی جانب تھا۔ لہٰذا پھر وہی سوال سامنے آتا ہے کہ حوادث کی

☆ ۱۲- سواں روڈ، اسلام آباد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ترتیب میں کیا رد و بدل ممکن ہے ؟ کیا دعا اس ترتیب کو روک سکتی ہے ؟میں نے عرض کیا : کیا حوادث کی کوئی ترتیب بھی ہے ؟ ارشاد ہوا : علت و معلول کا تقاضا تو یہی ہے کہ ان کی ترتیب ہو ، ماضی میں بھی اور مستقبل میں بھی" ---- حضرت علامہ نے فرمایا : وہ جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے ، وہ ہم سے اور ہماری دنیا سے بے تعلق تو نہیں ۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں اسی سے کہتے ہیں ۔ وہ کہتا ہے مجھ ہی سے دعا کرو ۔ میں تمہاری دعا سنتا اور اس کا جواب دیتا ہوں ۔ زندگی کیا ہے ؟ ایک مسلسل دعا ! "(۱)

دعا کا تصور خدا یا غیر مرئی قوتوں دیوی اور دیوتاؤں کے تصور سے منسلک ہے ۔ یہ بحث پرانی ہے کہ دعا انسان کی فطرت اور جبلت میں داخل ہے یا دعا کا سبب خارجی خطرات و آفات ہیں ؟ دعا تقویتِ قلب اور شرح صدر ہے یا فریبِ نفس ؟ دعا ، عزم و ہمت کی تجدید و توثیق ہے یا انسانی بے بسی ، احساسِ تنہائی اور بے چارگی کی مظہر ہے ؟ کیا سلسلہ امور کسی ایک برتر قوت کے تابع ہے یا کئی غیر مرئی طاقتیں اور اوتار وغیرہ سلسلہ امور کو چلاتے ہیں یا اپنے امور چلانے پر انسان کلی طور پر مختار ہے ؟ کیا خدا محض ایک لامحدود انرجی ہے؟ آفاقی تعقل اور کائناتی نظم کا نام خدا ہے یا خدا ایک علیم و بصیر اور سمیع زندہ جاوید ہستی ہے جس کا کائنات سے ماوراء بھی اپنا ایک تشخص ہے ؟

مذہبی کتب ، تاریخی آثار اور قیاس اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ عہد قدیم ہی سے انسان ایک برتر قوت اور کائنات میں یا اِس سے ماوراء ایک عظیم ہستی کا قائل رہا ہے چونکہ فطرت کے بارے میں ابھی اُس کا علم بہت کم تھا وہ مظاہرِ فطرت میں ربوبیت دیکھتا تھا۔ اسی لئے حضرت انسان درختوں، سانپوں، ستاروں، چاند اور سورج کی پرستش کرنے لگا ۔ ان کے علاوہ وہ کئی خیالی اور افسانوی ہستیوں کو بھی ماننے لگا جو اُس کے خیال کے مطابق اُس کو نفع یا نقصان پہنچانے پر قادر تھیں ان غیر مرئی ہستیوں کو وہ دیوی اور دیوتا کے ناموں سے پکارتا تھا ۔ کئی طاقتور اور غیر معمولی قسم کے انسانوں کو بھی اوتار کا درجہ دے دیا گیا اور اُن کی پرستش بھی شروع ہوگئی ۔ انسان کی مظاہر پرستی ، بت پرستی اور اوتار پرستی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ انسان فطرت کے قوانین سے واقف نہیں ہوا تھا ۔ وہ ابھی تک اس قابل نہیں ہوا تھا کہ خارجی خطرات اور قدرتی آفات سے اپنے آپ کو محفوظ کر سکے ۔ اس لئے وہ اپنی بے بسی اور جہالت کے باعث کبھی سورج کی پرستش کرتا ، کبھی چاند اور ستاروں سے اپنی قسمت وابستہ کر لیتا اور کبھی پتھر کے بتوں کے سامنے جھکتا ، اُن سے اپنی مرادیں مانگتا ۔ مختلف التجائیں کرتا، قربانی اور نذر و نیاز پیش کرتا ۔لیکن اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ قدیم دور ، خوف اور ڈر سے عبارت تھا اور انسان صرف دعاؤں اور التجاؤں پرانحصار کرتا تھا ۔ ہرگز نہیں انسان شروع ہی سے متجسس تھا اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ جدوجہد اور پیکار میں بھی لگا رہا ۔ وہ وحوش کا مقابلہ کرنے کے لئے موثر ہتھیار تیار کرنے لگا ۔ قدرتی آفات اور موسمی سختیوں سے بچاؤ کی تدابیر بھی سوچتا رہا اور ابنائے جنس سے لڑتا بھی رہا اور استفادۂ علم و تجربہ بھی کرتا رہا ۔

مذہبی کتب سے پتہ چلتا ہے کہ روئے زمین پر پہلے نائبِ خدا انسان یعنی حضرت آدمؑ کو علم دیا گیا ۔ وہ معرفتِ خدا رکھتے تھے اور وہ پہلے پیغمبر تھے ۔ یہ حقیقت ہے کہ بت پرستی اور مظاہر پرستی کے دور میں انبیاء نے توحید کا سبق دیا اور اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کو واضح کیا۔ قدیم تہذیبوں کے ادوار میں اگرچہ اکثریت شرک اور بت پرستی کی طرف مائل تھی لیکن چند اہلِ نظر اُن ادوار میں بھی تھے جو ایک خدا یا ایک برتر قوت کے قائل تھے ۔ قدیم تہذیبوں کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ خدا کے بارے میں حکماء کے دو مکاتبِ فکر رہے ہیں۔ جن حکماء کا نظم و ضبط ، امن و امان اور سکون و سرور کی طرف زیادہ دھیان تھا ، اُنہوں نے خدا کے بارے میں یہ تصور قائم کر لیا کہ خدا کائنات کا ایک آرڈر (Order) ہے ۔ کائنات میں جو تنظیم اور ربط و ضبط ہے وہی خدا ہے ۔چونکہ کائنات عقلی لحاظ سے مربوط ، منظم اور متوازن ہے اور کرہ ارض حیات آفرین اور حیات پرور ہے ۔اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ خدا اسی کائنات کے اندر جاری و ساری قوت ہے۔ اس کا خارج میں کوئی شخصی وجود محال ہے یا بالفاظ دیگر کائنات میں کارفرما قوانینِ فطرت کا دوسرا نام خدائی طاقت ہے ۔ کائنات کا نظام قوانینِ فطرت میں جکڑا ہوا ہے ۔ اس نظام کی منطق اور ترتیب کو دریافت تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس کو بدلا نہیں جا سکتا ۔ قدیم یونانی اور ہندی حکمت میں اسی قسم کے تصورات ملتے ہیں ۔ ان دونوں فلسفوں میں فرد کی بجائے نظام کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ ہندو مت میں کامل اور مطلق سکون کی خاطر ، فرد کو اپنا وجود مٹانا پڑتا ہے ۔ قدیم یونانی حکماء بھی غیر متغیر اور مثالی سکون کی تلاش میں تھے ۔ ہندو حکماء اور اہلِ باطن کے نزدیک دعا اور عبادت کی کوئی اہمیت نہیں یہ رسومات Rituals صرف عوام کی تسلی کے لئے ہیں۔ نجات کا اصل راستہ آخری آتما میں ضم ہونا ہے ۔ اسلامی تہذیب، نظام اور فرد دونوں کو اہم گردانتی ہے۔ اس تہذیب میں فرد کو انفرادیت اور آزادی حاصل ہے لیکن وہ ذمہ دار اور مسئول بھی ہے ۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق خدا اس کائنات کا خالق اور مالک ہے لیکن اس نے انسان کو بے پناہ طاقت اور صلاحیت بخشی ہے اور وہ اس دنیا میں اپنا مقام خود بنا سکتا ہے اور اس کائنات کی حالت کو بدل سکتا ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام شخصی خدا کے تصور کے مبلغ تھے ۔ واضح بات ہے کہ جب خدا ایک شخصیت ہے، وہ پوری کائنات پر محیط ہے، وہ ذرے ذرے کا علم رکھتا ہے ، وہ دیکھتا اور سنتا ہے تو ایسا خدا اس دنیا سے بے تعلق نہیں ہوسکتا۔ وہ اپنے بندوں کی دعائیں سنتا ہے اور انہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قبول کرتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ تورات و انجیل ، زبور اور قرآن حکیم میں کئی انبیاء کی دعائیں موجود ہیں ۔

علامہ اقبال نے اپنی شاعری اور خطبات میں جا بجا شخصی خدا کے تصور پر اپنے یقین کا اظہار کیا ہے اس لئے اقبال دعا مانگنے اور دعا کے اثرات کے قائل تھے بلکہ وہ دعا کو جزو ایمان سمجھتے تھے ۔ بچپن ہی سے وہ قرآن حکیم کی باقاعدہ تلاوت کرتے تھے اور نماز (جو دعا کی ایک جامع شکل ہے) کی اہمیت کے قائل تھے ۔ اُن کے بھتیجے اعجاز احمد روایت کرتے ہیں:

"۱۹۲۲ء کی گرمیوں کا ذکر ہے عدالت عالیہ کی تعطیل میں چچا جان سیالکوٹ آئے ہوئے تھے۔ اُس سال کے شروع میں اُنہیں نقرس کی وجہ سے بہت تکلیف رہی تھی۔۔۔۔۔ سحر خیزی کے آداب تو چچا جان سے لندن میں بھی نہ چھوٹے تھے ۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی بیدار ہوگئے ۔ مجھے اپنے انگوٹھے پر لنٹ کی گدی رکھے بیٹھے دیکھا تو اپنا ہاتھ بڑھا کر میرے ہاتھ پر رکھا اور دباتے ہوئے ہوئے فرمایا: " ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد" پھر پوچھا تمہاری چچی کہاں ہے ؟ میں نے کہا وضو کے لئے غسل خانے گئی ہیں ۔ پوچھا اذان ہوگئی۔ میں نے اثبات میں جواب دیا تو کہا تم نماز کے لئے نہیں گئے ۔ مجھے ندامت سے اعتراف ہے کہ باوجود اُن کے اِس ارشاد کے کہ" جہاں تک ممکن ہو نماز میں باقاعدہ ہو جاؤ" اُن دنوں میری نمازیں گنڈے دار تھیں ۔ کبھی پڑھ لی ۔ کبھی نہ پڑھی ۔ اِس غفلت کا اعتراف اُن سے کرنے میں تامل ہوا ۔ بات ٹالنے کے لئے کہا جو کچھ کر رہا ہوں یہ بھی تو عبادت ہی ہے ۔ انہوں نے فرمایا : " نہیں !نماز کو اولیت حاصل ہے ۔ درد میں اب تخفیف ہے تم اٹھ کر نماز ادا کرو"۔ میں نے ارشاد کی تعمیل کی(۲)۔

دعا اور عمل کی بحث میں ایک دلچسپ پہلو اس وقت ہمارے سامنے آتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جوں جوں انسان نے سائنس میں ترقی کی اتنا ہی وہ عمل کا زیادہ قائل ہوتا چلا گیا اور دعا کی اہمیت اس کے ذہن سے گھٹتی چلی گئی ۔ سائنس نے انسان کو اعتماد اور قوت بخشی اور اُسے محسوس ہونے لگا کہ وہ کائنات میں ایک فعال عنصر ہے ۔ وہ روئے زمین کا نقشہ بدل سکتا ہے ، وہ فضاؤں اور سمندروں پر بھی حکمرانی کر سکتا ہے ۔ سائنس کے نکتہ نظر سے زندگی کا نظام اعمال سے ہی چلتا ہے اس میں دعا اور کسی خدا سے التجا کرنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا ۔ سائنس ،مادی ذرائع اور طبعی قوانین پر انحصار کرتی ہے ۔ سائنس کے نکتہ نظر سے بارشیں جغرافیائی محل وقوع ، جنگلات اور موسمی عوامل پر منحصر ہوتی ہیں ۔ استسقاء کی دعا سے ہم تھل کے علاقے کو چراپونجی نہیں بنا سکتے ۔ دعاؤں اور مناجات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ذریعے ہم آسٹریلیا کی بارشوں کو صحراؤں اور ریگستانوں میں نہیں لا سکتے ۔ سائنس کے ذریعے انسان فطرت کے رازوں سے واقف ہوگیا ہے اور اسے پتا چل گیا ہے کہ بارش اور طوفان کے کیا اسباب ہوتے ہیں ؟ اس لئے اب وہ آسمانی بجلی سے نہیں ڈرتا ، چاند گرہن اور سورج گرہن سے خوف زدہ نہیں ہوتا۔ موجودہ سائنس نے عمل کی اہمیت کو زیادہ اجاگر کر دیا ہے بلکہ میں یوں کہوں گا کہ موجودہ سائنسی علوم نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ طبعی قوانین میں کسی قسم کی تبدیلی کی گنجائش نہیں اور مادی حالات کو انسان صرف اپنے عمل سے بدل سکتا ہے ۔

بحث کے اس مرحلے پر ایک معرکتہ الآرا پہلو سامنے آتا ہے وہ یہ کہ کیا اللہ تعالیٰ قوانینِ فطرت کو بدلنے یا قوانینِ فطرت کے خلاف کوئی واقعہ رونما کرنے پر قادر ہے ؟ جمہورمسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قوانین فطرت کی عموماً خلاف ورزی نہیں کرتا لیکن جب وہ چاہتا ہے وہ معمولات فطرت کو بدل دیتا ہے ۔ آگ کا کام جلانا ہے لیکن آگ ، ابراہیم علیہ السلام کے لئے ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور اُن کے لئے سراپا سلامتی بن جاتی ہے ۔ ضربِ کلیم سے پتھریلی چٹان سے بارہ چشمے جاری ہو جاتے ہیں ۔ اقبال کی خوبی یہ ہے کہ وہ ان معجزات کو وسیع اور ذومعنی تناظر میں دیکھتے ہیں ۔ اُن اسباق اور پیغام کو بے حجاب کرتے ہیں جو ان معجزات میں مضمر ہیں ۔ اقبال ان معجزات کے حوالے سے عالم بشریت کی قوتوں کو منکشف کرکے اعلیٰ انسانوں کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں ۔ وہ یہ پیغام دیتے ہیں کہ انسان اب بھی ان احوال کی چکاچوند سے گزر سکتا ہے اور ان کے فیوض و برکات سے معاشرے کو نئی حرارت اور نئی قوت بخش سکتا ہے ۔ وہ فرماتے ہیں :

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا　　　آگ کر سکتی ہے انداز گلستاں پیدا
(''جواب شکوہ'' ، بانگِ درا)

ہزار چشمہ ترے سنگ راہ سے پھوٹے　　　خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں　　　جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہُنر کیا!

(ضربِ کلیم)

اقبال فطرت (Nature) کو کردارِ الٰہی کا نام دیتے ہیں۔ وہ استقرائی عمل سے فطرت اور ماحول کو مسخر کرنے اورانسانی خدمات کے لئے اس میں تصرف کرنے کی دعوت دیتے ہیں ۔وہ اپنے خطبے میں فرماتے ہیں :

'' وہ (انسان) اپنے ماحول کی تسخیر کر سکتا ہے تو صرف عقل استقرائی کی بدولت لیکن عقل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

استقرائی اُس کے اپنے حاصل کرنے کی چیز ہے"(۳)۔

انسانی جذبات ، ایمانیات اور روحانیات کے شعبے تک سائنس کی رسائی نہیں اور یہ وہ دنیا ہے جہاں خدا اور بندے کے تعلق اور انسانوں کے باہمی تعلقات کے معاملات زیرِ بحث آتے ہیں ۔ دعا کے ذریعے اللہ سے تعلق مضبوط ہوتا ہے اس لئے ہر مذہب میں اللہ سے مناجات کرنے کے لئے مختلف دعائیں اور عبادت کی کئی شکلیں ہیں ۔ اسی طرح انسانوں کے حقوق و فرائض کے لئے عالمی مذاہب نے بالخصوص دین اسلام نے بنیادی اصول و احکام عطا کئے ہیں ۔

اقبال کہتے ہیں کہ اسلام میں استخراجی طرزِ فکر بھی ہے اور استقرائی طرز بھی ہے ۔ اسلام طبیعی علوم کا بھی قائل ہے اور ایمانیات اور روحانیات میں وحی الٰہی کی اطاعت کو بھی ضروری قرار دیتا ہے ۔ اقبال اپنے خطبے میں ارشاد فرماتے ہیں :

" پیغمبرِ اسلام کی ذات گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطے کی ہے بہ اعتبار اپنے سرچشمۂ وحی کے آپ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے لیکن بہ اعتبار اُس کی روح دنیائے جدید سے ، یہ آپ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم و حکمت کے وہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کا آئندہ رخ کے عین مطابق تھے لہٰذا اسلام کا ظہور ۔۔۔۔۔۔ استقرائی عقل کا ظہور ہے ۔ اسلام میں نبوت چونکہ اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی ۔ لہٰذا اِس کا خاتمہ ضروری ہوگیا ۔ اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا اِس کے شعور ذات کی تکمیل ہوگی تو یونہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے آکر دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا یا موروثی بادشاہت کو جائز نہیں رکھا یا بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا یا عالم فطرت اور عالم تاریخ کو علم انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اس لئے کہ ان سب کے اندر یہ نکتہ مضمر ہے کیونکہ یہ سب تصور خاتمیت ہی کے مختلف پہلو ہیں لیکن یہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حیات انسانی اب واردات باطن سے ، جو باعتبار نوعیت انبیاء کے احوال و واردات سے مختلف نہیں ہمیشہ کے لئے محروم ہوچکی ہے ۔ قرآن مجید نے آفاق و انفس دونوں کو علم کا ذریعہ قرار دیا ہے"(۴)۔

اقبال شد و مد سے عمل کی تلقین کرتے ہیں وہ ان لوگوں کو روحِ اسلام سے بیگانہ قرار دیتے ہیں جو دعا و صلوٰۃ کو محض رسوم Rituals کی حیثیت سے سرانجام دیتے ہیں ۔ وہ نماز کے مقاصد اور عملی اسباق سے محروم رہتے ہیں ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تیرا امام بے حضور ، تیری نماز بے سرور ایسی نماز سے گذر ، ایسے امام سے گذر!

(بالِ جبریل)

اقبال اس عالم کو روزِ محشر کہتے ہیں جہاں صرف عمل کی قدر و قیمت ہے ، فرماتے ہیں :

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصہ محشر میں ہے پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

(''زندگی'' ، بانگِ درا)

یہاں اس امر کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جو بھی مفکر عظمتِ انسان اور انسان کی بے پناہ صلاحیتوں کا قائل ہوگا وہ ہمیشہ یہ دعوت دے گا کہ انسان اپنے عمل اور اپنی کوشش سے اپنا مقدر سنوار سکتا ہے اور اس جہاں کو خوب سے خوب تر بنا سکتا ہے ۔ اس قسم کے مفکرین کو عمل سے ہی فرصت نہیں ہوتی اُن کا عمل ہی اُن کی دعا ہوتی ہے ۔'' جب چینی مفکر کنفیوشس بسترِ علالت پر پڑے تھے اُن کے شاگرد Tzu Lu نے کہا کہ میں آپ کے لئے دعا کرتا ہوں ۔ کنفیوشس نے سوالیہ انداز میں کہا یہ دعا کیا ہوتی ہے ؟ (کیا اِس سے کچھ فرق پڑتا ہے) میری ساری زندگی سراپا دعا ہے[۵]

آیئے ! اب ذرا تفصیل سے اس امر کا جائزہ لیتے ہیں کہ اقبال نے اپنی شعری اور نثری زبان میں بار بار عمل اور جدوجہد کی طرف توجہ کیوں مبذول کرائی اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اُن کے نزدیک دُعا کا حقیقی مقصد اور غایت کیا ہے ؟ کوئی بھی مفکر اپنے ماحول اور دور سے بے نیاز نہیں ہوسکتا۔ شاعر اپنے عصر کی روح سے گہرا اثر قبول کرتا ہے ۔ وہ مفکر جو شاعری کو انسان کی خدمت اور اعلیٰ و ارفع مقاصدِ حیات کی ترویج کے لئے ایک ذریعہ تصور کرتا ہے وہ اپنے عصری حالات اور تقاضوں کا تجزیہ کرکے اپنے قریبی حلقوں کو بالخصوص اور پوری نوع انسان کو بالعموم ایک پیغام دیتا ہے ۔ اقبال کا زمانہ یورپ کے سیاسی تفوق اور علمی عروج کا زمانہ تھا۔ اہلِ یورپ نے اپنی محنت، مہم جوئی اور سائنس اور ٹیکنالوجی میں اپنی برتری کی بدولت ایشیاء اورافریقہ کے کئی ملکوں کو اپنا غلام اور محکوم بنا لیا تھا۔ محکوم قوموں میں ذہنی پستی اور بے بسی بڑھتی جا رہی تھی ۔ برصغیر ہندوپاک جہاں مسلمانوں نے سات سو سال تک حکومت کی تھی ۔ وہاں مسلمان غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ معاشی لحاظ سے غریب سیاسی لحاظ سے بے اثر اور ذہنی طور پر خلفشار اور پراگندگی کا شکار تھے۔ اقبال اہل وطن کا حال دیکھ کر بہت رنجیدہ خاطر ہوتے تھے ۔وہ اُن کے انحطاط کے اسباب جان چکے تھے اور ان میں سب سے بڑا سبب اہل ہند کی بے عملی اور سہل پسندی تھی ۔ اقبال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نے اِن مایوس اور بے عمل لوگوں کو زندگی اور عمل کی تعلیم دی ۔ اُن کا روئے سخن تین قسم کے لوگوں کی طرف تھا ۔ اولاً : تقدیر پرست لوگ ۔ یہ حضرات اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ نظامِ کائنات پہلے ہی سے طے شدہ ہے ۔ دولت ، رزق ، بیماری ، صحت ، خوشی اور غم ،محبت اور دشمنی، آفات و حادثات کے بارے میں پہلے ہی سے فیصلے ہو چکے ہیں ۔ انسان قسمت کے ان فیصلوں کو بدلنے پر قادر نہیں ۔ اس لئے اگر ہماری قسمت میں غلامی اور ذلت ہے تو ہم تقدیر کے اِس اٹل فیصلے سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے ۔ ہمیں خواہ مخواہ دل گرفتہ نہیں ہونا چاہیے اور تقدیر کی مسلط کی ہوئی ذلت اور رسوائی کو قبول کر لینا چاہیے ۔ یہ لوگ اِس نظریے کی تبلیغ کرتے تھے کہ ہم اپنی کوششوں سے تقدیر کو نہیں بدل سکتے ہاں اگر جب کبھی تقدیر میں ہمارے حالات کا سنورنا لکھا ہوگا تو وہ خود بہ خود سنور جائیں گے ۔ ثانیاً: وہ لوگ جو اس پر یقین رکھتے تھے کہ کائنات کا نظام غیر مرئی اور خفیہ طاقتیں چلا رہی ہیں ۔ ان کو اگر خوش رکھا جائے تو زندگی میں کامیابی اور خوشی ملتی رہتی ہے اور اگر یہ طاقتیں ناراض ہو جائیں تو برے دن آ جاتے ہیں ۔ یہ طاقتیں انسان کی اچھائی اور برائی پر مکمل تصرف رکھتی ہیں ۔ اس لئے مختلف دعاؤں ، پوجا پاٹ ، نذرو نیاز ، منتروں اور قربانی ایسے طریقوں سے ان طاقتوں کو خوش رکھنا چاہیے ۔ اس قسم کے اعتقادات عام ہندوؤں اور توہم پرست مسلمانوں میں پائے جاتے تھے ۔ ان لوگوں کے نزدیک عمل کی ثانوی حیثیت ہے ۔ اس لئے یہ لوگ سادھوؤں ، بھکشوؤں اور پیروں فقیروں کی تلاش میں رہتے ہیں اور ان سے اپنے مسائل حل کرانے اور اپنے کام سنوارنے کی درخواستیں کرتے رہتے ہیں ۔ کئی لوگ تو اعلیٰ عہدوں کی طلب یا ان پر قائم رہنے کے لئے بھی مخفی طاقتوں پر یقین رکھتے ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ باطن کی دنیا میں بھی اقتدار کا ایک نظام ہے اور باطن میں مقتدر ہستیاں ظاہری اقتدار پر نصب و عزل کے متعلق فیصلے صادر کرتی ہیں ۔ ثالثاً : وہ لوگ اور قومیں جو اپنے آپ کو خدا کے لاڈلے اور چہیتے سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ وہ خدا کے برگزیدہ انسان ہیں اور دنیا کے باقی لوگ خدا کی رحمت سے دور ہیں ۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ خدا ان کا طرفدار ہے وہ اس دنیا میں ان کی مدد و نصرت کرتا ہے ۔ ان کے اعتقادات کو تائید خداوندی حاصل ہے ۔ اگر وہ کسی دوسری قوم یا فرد سے مقابلہ کریں گے تو خدا ان کا طرفدار ہوگا ۔ یہ حضرات اپنے اعمال کا محاسبہ نہیں کرتے ، اپنے مادی وسائل کا جائزہ نہیں لیتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کے برگزیدہ ہیں اور خدا ہر حال میں اُن کا ساتھ دے گا ۔ عہدِ رسالت میں قرآن حکیم نے اس قسم کا رویہ رکھنے والے لوگوں کے احوال کو بیان کیا ہے۔ سورۃ بقرہ میں بنی اسرائیل کے بارے میں کہا گیا ہے :

و قالوا لن تمسنا النار الا ایاما معدودہ قل اتخذتم عنداللہ عھدا فلن یخلف اللہ عھدہ ام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تقولون علی اللہ ما لا تعلمون O بلیٰ من کسب سیئة و احاطت بہ خطیئتہ فاولٓئک اصحٰب النار ...... O

" وہ کہتے تھے کہ ہمیں آگ نہیں چھوئے گی بجز چند دنوں کے ۔ کہہ دیجیئے کہ کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے رکھا ہے کہ وہ اُس کی خلاف ورزی نہیں کرے گا ۔ یا تم اللہ کے بارے میں ایسی بات کرتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں ہے ۔ ہاں کیوں نہیں ! جس نے بھی برائیاں کمائیں اور اُس کی خطاؤں نے اُس کا احاطہ کر لیا ایسے تمام لوگ اصحاب النار ہیں "۔ (البقرۃ ۲، آیات ۸۰، ۸۱)

اسی سورۃ میں ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے :

وقالوا لن یدخل الجنة الا من کان ھوداً او نصٰریٰ تلک امانیھم قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صٰدقین O (بقرۃ ۲، آیت ۱۱۱)

" وہ کہتے تھے کہ جنت میں یہود و نصریٰ کے علاوہ کوئی اور داخل نہیں ہوگا ۔ یہ اُن کی محض خواہشات ہیں ۔ کہہ دیجیئے کہ اگر تم سچے ہو تو واضح دلیل لاؤ "۔

مسلمانوں کے سیاسی زوال کے دور سے اس قسم کے خیالات کچھ مسلمانوں میں بھی پائے جاتے ہیں ۔ وہ اپنی حیات دنیا کی طرف توجہ نہیں دیتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ آخرت کی زندگی میں آرام ، راحتیں اور کامیابیاں اُن کے لئے مختص ہیں ۔ وہ اجتماعی زندگی کے تقاضوں اور محنت و سعی کے شعبوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اُن کے لئے صوم و صلوٰۃ کا اجر و ثواب ہی کافی ہے، آخرت میں اُن کا ٹھکانہ جنت ہے اور وہ اُن کی دائمی زندگی ہے ۔

اقبال چشمِ بصیرت سے یہ دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب اُن کا علمی جمود ، فکری بانجھ پن اور اُن کی عیش پسندی اور تن آسانی ہے۔ دورِ انحطاط میں وہ کئی روحانی و ذہنی بیماریوں کا شکار ہوگئے۔ وہ تصوف خفتہ کی طرف مائل ہوگئے ۔ اُن کی ادبیات یاس و قنوطیت مستی و خود فراموشی سے معمور ہوتی چلی گئیں۔ اُن کے علماء فضلاء فروعی اور زندگی سے لاتعلق مسائل میں تعمق کرنے لگے ۔ اجتماعی معاملات اُن کے تفکر اور بحث کے موضوعات نہ رہے ۔ اس طرح آہستہ آہستہ معاشرے کی علمی و روحانی قیادت کرنے والے حلقے خود بھی بے عمل ہوگئے اور وہ بے عملی کی تبلیغ بھی کرنے لگے۔ اقبال نے اس افسوسناک حالت کا اس طرح ذکر کیا ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خبر نہیں کیا ہے نام اِس کا خدا فریبی کہ خود فریبی   عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

صوفی کی طریقت میں مستی احوال   ملا کی شریعت میں فقط مستی گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق   افکار میں سرمست! نہ خوابیدہ نہ بیدار!
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو   ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستی کردار

نمازیں پڑھنا اور روزے رکھنا بلاشبہ عبادات میں شامل ہیں لیکن ان سے مشکل تر عبادات رزقِ حلال کے لئے سعی کرنا، عناصر پر حکمرانی کرنا اور معاشرے میں عدل و انصاف قائم کرنا ہے۔ انسان نائبِ خدا کی حیثیت سے عناصر پر حکمرانی کرنے اور اس دنیا میں عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے آیا ہے۔ اُس کا کام محض تسبیح و تہلیل نہیں ہے۔ اقبال فرماتے ہیں :

نہ کر تقلید اے جبرئیل میرے جذب و مستی کی   تن آسان عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

(بالِ جبرئیل)

جو قوم بھی عمل سے غافل ہو جائے اُس کی تقدیر میں پستی اور غلامی ہے چاہے وہ قوم شب و روز تسبیح و تہلیل میں مصروف رہے اور خدا سے الحاح و انکسار کے ساتھ دعائیں مانگتی رہے۔ محض دعاؤں سے نہ تو کھیت میں ہل چلتے ہیں۔ نہ فصلیں ہری بھری ہوتی ہیں نہ ہی سیلابوں اور قدرتی آفات پر قابو پایا جا سکتا ہے اور نہ ہی معدنیات دریافت ہوتی ہیں اور نہ ہی برق و بخار پر تصرف حاصل ہوتا ہے نہ ہی ملک اور قوم دولت مند ہوتے ہیں۔ خوشحالی، ترقی اور غلبہ باہمت، ولولہ خیز اور محنتی لوگوں کا مقدر ہے۔ تاریخ بے عمل قوموں کو معاف نہیں کرتی۔ اقبال فرماتے ہیں :

ہاں ایک حقیقت ہے کہ معلوم ہے سب کو   تاریخِ امم جس کو نہیں ہم سے چھپاتی
ہر لحظہ ہے قوموں کے عمل پر نظر اُس کی   براں صفت تیغ دوپیکر نظر اُس کی

(ضربِ کلیم)

اقبال نے نہ صرف فلسفہ و حکمت اور ادبیات عالم کا مطالعہ کیا تھا بلکہ اُنہیں تاریخ عالم سے گہرا شغف تھا اور اُنہوں نے اپنے تاریخی شعور سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اہل یورپ کی ترقی بالخصوص انگریزوں کی ترقی ان کی عملیت پسندی کا ثمر ہے۔ تاریخی واقعات کے اسباب و علل ہوتے ہیں۔ تاریخ محض اتفاقات کا نام نہیں ہے۔ تاریخی واقعات کو سمجھنے کے سلسلے میں اقبال انگریزوں کا بطور خاص ذکر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے ہیں ۔ اپنے ایک خطبے میں فرماتے ہیں " مغربی اقوام اپنی قوتِ عمل کی وجہ سے تمام اقوامِ عالم میں ممتاز ہیں اور اِس وجہ سے اسرار زندگی کو سمجھنے کے لئے اُن کے ادبیات و تخیلات اہل مشرق کے واسطے بہترین رہنما ہیں ۔۔۔۔۔۔ جس طرح رنگ و بو وغیرہ کے لئے مختص حواس ہیں اِسی طرح انسانوں میں ایک حاسہ بھی ہے جس کو " حسِ واقعات " کہنا چاہیے ۔ ہماری زندگی واقعات گرد و پیش کے مشاہدہ کرنے اور اُن کے صحیح مفہوم کو سمجھ کر عمل پیرا ہونے پر منحصر ہے ۔۔۔۔۔ حق یہ ہے کہ انگریزی قوم کی عملی نکتہ رسی کا احسان تمام دنیا کی قوموں پر ہے کہ اس قوم میں " حس واقعات " اور اقوام عالم کی نسبت زیادہ تیز اور ترقی یافتہ ہے ۔۔۔۔۔۔ پس حکمائے انگلستان کی تحریریں ادبیات عالم میں ایک خاص پایہ رکھتی ہیں اور اِس قابل ہیں کہ مشرقی دل و دماغ اُن سے مستفید ہوکر اپنی قدیم فلسفیانہ روایات پر نظر ثانی کریں "(۶) ۔

قرآنی بصیرت اور تاریخ کی روشنی میں اقبال کا یہ پیغام ہے کہ وہ فرد یا قوم کامیاب اور طاقت ور ہوتے ہیں جو عمل پیہم پر یقین رکھتے ہیں اور ایک لحہ بھی جدوجہد کے بغیر نہیں گزارتے ۔ اقبال کے نزدیک فرد یا قوم کی کامیابی کا میزان ایام نہیں بلکہ معیارِ حیات اُس قوم کے کارنامے ہیں ۔ وہ فرماتے ہیں :

سعی پیہم ہے ترازوئے کم و کیف حیات　　　تیری میزان ہے شمار سحر و شام ابھی

(بانگِ درا)

اقبال کا پیغام ہے کہ حرکت اور محنت کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا ۔ کائنات متحرک ہے اور کرۂ ارض پر نہ صرف موسم بدلتے رہتے ہیں بلکہ نباتات ، طیور و وحوش اور حیوانات سب اپنی جبلتوں اور ضرورتوں کے مطابق سرگرم عمل ہیں ۔ یہ سب فطرت کے اشارے ہیں انسان کے لئے جو کہ مقصودِ کائنات ہے اور اشرف المخلوقات ہے ۔ انسان کے لئے حرکت و عمل بدرجہ اولیٰ ضروری ہے کیونکہ اس نے نائب خدا کی حیثیت سے ایک طرف کائنات کے نظام کو چلانا ہے ۔ یعنی فطرت کو مسخر کرنا ہے اور باقی مخلوقات پر اپنی افضلیت کو ثابت کرنا ہے اور دوسری طرف ابنائے جنس کے ساتھ مل جل کر اعلیٰ تمدن کی بنیاد رکھنا ہے ۔ ان دونوں وظائف کے لئے انسان کی مدد کے لئے کوئی غیر مرئی مخلوق نہیں ہے اس نے اپنی مدد آپ کرنا ہے ۔ فطرت کی مخالف قوتوں سے خود ٹکرانا ہے ۔ زلزلوں، بیماریوں اور دیگر آفات سے خود نمٹنا اور ان پر قابو پانا ہے بلکہ بحیثیت انسان اپنی تخریبی اور منفی قوتوں کو بھی زیر کرنا ہے یہ سب کام محض تمناؤں اور دعاؤں سے سرانجام نہیں پا سکتے ۔ اس کے لئے تازہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

افکار، نئے نئے تجربات مسلسل کوشش اور انتھک محنت اور غیر مختتم عمل کی ضرورت ہے جب انسان یہ سب کچھ کر گزرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ نوید سناتے ہیں :

انی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکرا و انثیٰ ...... O (سورۃ آل عمران، آیت ۱۹۵)

''بے شک میں تم میں سے کسی عامل کے عمل کو چاہے وہ مرد ہو یا عورت ، ضائع نہیں کرتا ـــــ''

اقبال نے کس جامع اور دل نشیں انداز میں پیغامِ عمل دیا ہے ۔ فرماتے ہیں :

یقیں محکم ، عمل پیہم ، محبت فاتحِ عالم جہادِ زندگی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

(بانگِ درا)

اقبال اس شعر میں محبت کو فاتحِ عالم کی حیثیت سے دیکھتے ہیں ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عالم کو جنگ سے فتح نہیں کیا جا سکتا بلکہ محبت اور حسنِ اخلاق سے انسانوں کو اپنا گرویدہ بنایا جا سکتا ہے ۔ قوت اور طاقت سے کسی کے خیالات کو بدلا نہیں جا سکتا ۔ عسکری قوت سے کسی قوم کو زیادہ عرصے تک محکوم نہیں رکھا جا سکتا بلکہ دلوں کو فتح کرنے کے لئے اعلیٰ اخلاق ، رواداری اور فکر و عمل کی بلندی درکار ہوتی ہے ۔ کوئی قوم اپنے حسنِ عمل سے دوسری قوموں کو متاثر کرسکتی ہے ۔ اقبال نے ان مشرقی اور مغربی علماء کو پسند کیا ہے جن کے کلام میں عمل و حرکت پر زور ہے ۔ انہوں نے ان حکماء اور شعراء کے کلام سے بچنے کی تلقین کی ہے جن کے فلسفے اور شاعری میں سکون و سرور مایوسی اور خود فراموشی کا سامان ہے ۔ اقبال نے اِس شعر میں یہ بھی وضاحت کی ہے کہ پوری زندگی جدوجہد اور عمل کا تقاضا کرتی ہے۔ پوری زندگی جہاد ہے جس میں ہمیشہ یقینِ محکم، عمل پیہم اور محبت سے ترقی و کامیابی کے راستے طے ہوتے ہیں ۔

اقبال مسلمانوں کو جب سعی و عمل کی دعوت دیتے ہیں تو اُن کے سامنے اُسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہوتا ہے ۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی جدوجہد اور ثبات و استقلال سے عبارت ہے ۔ آپؐ کی حیات طیبہ حسنِ عمل کی تفسیر ہے ۔ آپ کی عملی زندگی یہ درس دیتی ہے کہ تدبیر و عمل کے بعد دُعا کا مرحلہ آتا ہے ۔ پہلے اپنے وسائل کو مومنانہ فراست کے ساتھ بروئے کار لائیے اور پھر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائیے ۔ دعا مانگنے اور اس کی قبولیت کے لئے بھی کئی شرائط ہیں ۔ایک مشہور حدیث نقل کی جاتی ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الرجل یطیل السفر اشعث اغبر یمد یدہ الی السماء یا رب یا رب ومطعمہ حرام و مشربہ حرام و ملبسہ حرام و غذی بالحرام فانیٰ یستجاب لذلک (صحیح مسلم)

" ایک شخص جو دور دراز سفر میں ہو اس کا چہرہ غبار آلود ہو اور پریشانی و پراگندگی کی حالت میں ہاتھ اٹھا کر یارب یارب کہے یعنی دعا کرے ۔ حالانکہ اُس کا کھانا ، پینا اور پہناوا حرام ہو اور وہ حرام کمائی ہی صرف میں لاتا ہو تو اُس کی دعا قبول کیسے ہو ؟ "

دعا اور عمل کے حوالے سے دو مشہور غزوات کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں جو نہایت ہی سبق آموز ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مقامِ بدر پر جنگ کی حکمت عملی سے متعلق چھوٹی چھوٹی جزئیات کے بارے میں بھی رہنمائی فرمائی " طریقہ جنگ کے بارے میں ایک خصوصی رہنمائی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جب مشرکین گھمکھٹہ کرکے تمہارے قریب آجائیں تو اُن پر تیر چلانا اور اپنے تیر بچانے کی کوشش کرنا (یعنی پہلے سے فضول تیر اندازی کرکے تیروں کو ضائع نہ کرنا) اور جب تک وہ تم پر چھا نہ جائیں تلوار نہ کھینچنا ـــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفیں درست کرکے واپس آتے ہی اپنے پاک پروردگار سے نصرت و مدد کا وعدہ پورا کرنے کی دعا مانگنے لگے ۔ آپ کی دعا یہ تھی :

اللھم انجزنی ما وعدتنی اللھم انشدک عھدک ووعدک O

" اے اللہ ! تو نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے اُسے پورا فرما دے ۔ اے اللہ ! میں تجھ سے تیرے عہد اور تیرے وعدے کا سوال کر رہا ہوں"۔

پھر جب گھمسان کی جنگ شروع ہوئی ، نہایت زور کا رن پڑا اور لڑائی شباب پر آگئی تو آپؐ نے یہ دعا فرمائی :

اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ الیوم لا تعبد O اللھم ان شئت لم تعبد بعدالیوم ابداً O

" اے اللہ ! اگر آج یہ گروہ ہلاک ہوگیا تو تیری عبادت نہ کی جائے گی ، اے اللہ ! اگر تو چاہے تو آج کے بعد تیری عبادت کبھی نہ کی جائے ـــــــ"

آپؐ نے زرہ پہن رکھی تھی ۔ آپ پُرجوش طور پر آگے بڑھ رہے تھے اور فرماتے جارہے تھے:

" سیھزم الجمع و یولون الدبر O (۴۵:۵۴)

"عنقریب یہ جتھہ شکست کھا جائے گا اور پیٹھ پھیر کر بھاگے گا"(۷)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غزوہ احد کے واقعات کا تجزیہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ذہانت، قوتِ ارادی اور عملی جدوجہد ہی سے نتائج حاصل ہوتے ہیں عملی کوشش اور تدبیر میں کوئی خامی یا غلطی ہو تو اللہ تعالیٰ متقی اور پرہیز گار لوگوں کو بھی آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔ محض دعاؤں اور نیک تمناؤں سے مقاصد حاصل نہیں ہوتے۔ اپنی غلطیوں کے برے نتائج سے متقی اشخاص بھی نہیں بچ سکتے۔ "غزوہ احد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچاس ماہر تیر اندازوں کا ایک دستہ منتخب کیا جن کی کمان حضرت عبداللہؓ ابن جبیر کے سپرد کی۔ اس دستہ کو جبل رماۃ پر ایک گھاٹی پر تعینات فرمایا۔ آپؐ نے اس دستے کے کمانڈر کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"شہسواروں کو تیر مار کر ہم سے دور رکھو۔ وہ پیچھے سے ہم پر چڑھ نہ آئیں۔ ہم جیتیں یا ہاریں تم اپنی جگہ رہنا۔ تمہاری طرف سے ہم پر حملہ نہ ہونے پائے۔" پھر آپؐ نے تیر اندازوں کو مخاطب کر کے فرمایا: "ہماری پشت کی حفاظت کرنا۔ اگر دیکھو کہ ہم مارے جا رہے ہیں تو ہماری مدد کو نہ آنا اور اگر دیکھو کہ ہم مالِ غنیمت سمیٹ رہے ہیں تو ہمارے ساتھ شریک نہ ہونا"۔

اور صحیح بخاری کے الفاظ کے مطابق آپؐ نے یوں فرمایا:

"اگر تم لوگ دیکھو کہ ہمیں پرندے اچک رہے ہیں تو بھی اپنی جگہ نہ چھوڑنا یہاں تک کہ میں بلا بھیجوں اور اگر تم لوگ دیکھو کہ ہم نے قوم کو شکست دے دی ہے اور انہیں کچل دیا ہے، تو بھی اپنی جگہ نہ چھوڑنا یہاں تک کہ میں بلا بھیجوں۔۔۔۔۔"

لیکن عین اُس وقت جبکہ یہ مختصر سا اسلامی لشکر اہلِ مکہ کے خلاف تاریخ کے اوراق پر ایک اور شاندار فتح ثبت کر رہا تھا جو اپنی تابناکی میں جنگِ بدر کی فتح سے کسی طرح کم نہ تھی۔ تیر اندازوں کی اکثریت نے ایک خوفناک غلطی کا ارتکاب کیا جس کی وجہ سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔۔۔ چالیس تیر اندازوں نے اپنے مورچے چھوڑ دیئے اور مالِ غنیمت سمیٹنے کے لئے عام لشکر میں جا شامل ہوئے اس طرح مسلمانوں کی پشت خالی ہوگئی اور وہاں صرف عبداللہؓ ابن جبیر اور اُن کے نو ساتھی باقی رہ گئے۔۔۔ خالدؓ بن ولید جو اس سے پہلے تین بار اس مورچے کو سر کرنے کی کوشش کر چکے تھے، اس زریں موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نہایت تیزی سے چکر کاٹ کر اسلامی لشکر کی پشت پر جا پہنچے اور چند لمحوں میں عبداللہؓ ابن جبیر اور اُن کے ساتھیوں کا صفایا کر کے مسلمانوں پر پیچھے سے ٹوٹ پڑے۔۔۔ اب مسلمان آگے اور پیچھے دونوں طرف سے گھیرے میں آ چکے تھے۔ گویا چکی کے دو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پاٹوں کے بیچ میں پڑ گئے تھے ۔۔۔۔۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف نو صحابہ کی ذرا جتنی نفری کے ہمراہ پیچھے تشریف فرما تھے ۔۔۔۔ آپؐ کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو آپؐ اپنے نو رفقاء سمیت تیزی سے بھاگ کر کسی محفوظ جگہ چلے جاتے اور اپنے لشکر کو جو اب نرغے میں آیا ہی چاہتا تھا اُس کی قسمت پر چھوڑ دیتے یا اپنی جان خطرے میں ڈال کر اپنے صحابہ کو بلاتے ۔۔۔۔۔ ایک مضبوط محاذ تشکیل دیتے ۔۔۔۔۔ آزمائش کے اس نازک ترین موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبقریت اور بے نظیر شجاعت نمایاں ہوئی ۔ کیونکہ آپؐ نے جان بچا کر بھاگنے کی بجائے اپنی جان خطرہ میں ڈال کر صحابہ کرامؓ کی جان بچانے کا فیصلہ کیا ۔۔۔۔۔ عین اُس وقت جبکہ اسلامی لشکر نرغے میں آ کر مشرکین کی چکی کے دو پاٹوں کے درمیان پس رہا تھا ۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلمکے گردا گرد بھی خون ریز معرکہ آرائی جاری تھی ۔۔۔۔ اُنہوں نے اپنا تابڑ توڑ حملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر مرکوز رکھا ۔۔۔۔۔ اِس حملے میں عتبہ بن ابی وقاص نے آپؐ کو پتھر مارا جس سے آپ پہلو کے بل گر گئے ۔ آپؐ کا داہنا نچلا رباعی دانت ٹوٹ گیا اور آپؐ کا نچلا ہونٹ زخمی ہوگیا اور اڑیل سوار عبداللہ بن شہاب زہری نے آگے بڑھ کر آپؐ کی پیشانی زخمی کر دی ۔ ایک اڑیل سوار عبداللہ بن قمئہ نے لپک کر آپؐ کے کندھوں پر ایسی سخت تلوار ماری کہ آپؐ ایک مہینے سے زیادہ عرصے تک اُس کی تکلیف محسوس کرتے رہے البتہ آپؐ کی دوہری زرہ نہ کٹ سکی ۔ اس کے بعد اُس نے پہلے ہی کی طرح پھر ایک زور دار تلوار ماری ۔ جو آنکھ سے نیچے کی اُبھری ہوئی ہڈی پر لگی اور اس کی وجہ سے خود کی دو کڑیاں چہرے کے اندر دھنس گئیں ساتھ ہی اُس نے کہا :''اسے لے، میں قمئہ (توڑنے والے) کا بیٹا ہوں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چہرے سے خون پونچھتے ہوئے فرمایا: '' اللہ تجھے توڑ دے۔''

صحیح بخاری میں مروی ہے کہ آپ کا رباعی دانت توڑ دیا گیا اور سر زخمی کر دیا گیا ۔ اس وقت آپؐ اپنے چہرے سے خون پونچھتے جا رہے تھے اور کہتے جا رہے تھے: '' وہ قوم کیسے کامیاب ہو سکتی ہے جس نے اپنے نبی کے چہرے کو زخمی کر دیا اور اُس کا دانت توڑ دیا حالانکہ وہ انہیں اللہ کی طرف دعوت دے رہا تھا اس پر اللہ عز و جل نے یہ آیت نازل فرمائی :

لیس لک من الامر شیء او یتوب علیھم او یعذبھم فانھم ظلمون O (۱۲۸:۳)

''آپؐ کو کوئی اختیار نہیں اللہ چاہے تو انہیں توبہ کی توفیق دے اور چاہے تو عذاب دے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ وہ ظالم ہیں(۷)۔"

صحیح مسلم کی روایت میں بھی یہی ہے کہ آپؐ بار بار کہہ رہے تھے ۔

رب اغفر لقومی فانھم لا یعلمون O

"اے پروردگار ! میری قوم کو بخش دے ۔ وہ نہیں جانتی"۔

قاضی عیاض کی شفا میں یہ الفاظ ہیں ۔

اللھم اھد قومی فانھم لا یعلمون O

"اے اللہ ! میری قوم کو ہدایت دے ۔ وہ نہیں جانتی"۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھنڈا حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو دیا اُنہوں نے جم کر لڑائی کی ۔ وہاں پر موجود باقی صحابہ کرام نے بھی بے مثال جان بازی و سرفروشی کے ساتھ دفاع اور حملہ کیا جس سے بالآخر اس بات کا امکان پیدا ہوگیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین کی صفیں چیر کر نرغے میں آتے ہوئے صحابہ کرام کی جانب راستہ بنائیں ۔ چنانچہ آپؐ نے قدم آگے بڑھایا اور صحابہ کرام کی جانب تشریف لائے ۔ سب سے پہلے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے آپؐ کو پہچانا ۔ خوشی سے چیخ پڑے ، مسلمانو ! خوش ہو جاؤ۔ یہ ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ خاموش رہو ۔ تاکہ مشرکین کو آپؐ کی موجودگی اور مقام موجودگی کا پتا نہ لگ سکے ـــ۔ مگر اُن کی آواز مسلمانوں کے کانوں تک پہنچ چکی تھی ۔ چنانچہ مسلمان آپ کی پناہ میں آنا شروع ہوگئے اور رفتہ رفتہ تمیں صحابہ جمع ہوگئے ۔ خلاصہ یہ کہ اس طرح کی جان بازی اور جان سپاری کے ساتھ یہ دستہ منظم طور سے پیچھے ہٹتا ہوا پہاڑ کی گھاٹی میں واقع کیمپ تک جا پہنچا اور بقیہ لشکر کے لئے بھی اس محفوظ مقام تک پہنچنے کا راستہ بنا دیا ۔ چنانچہ باقیماندہ لشکر بھی آپؐ کے پاس آگیا اور حضرت خالدؓ کی فوجی عبقریت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فوجی عبقریت کے سامنے ناکام ہوگئی"(۸)۔

اندازہ لگایئے کہ چالیس تیر اندازوں کی غلطی کی وجہ سے مسلمانوں کو کس قدر نقصان ہوا اور کس قدر تکالیف اٹھانی پڑیں ۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں جو جماعت جنگِ احد میں لڑ رہی تھی وہ تقویٰ ، راست بازی اور تعلق باللہ میں اپنی مثال آپ تھی ۔ عالمگیر اور آفاقی معیار کے مطابق بھی یہ جماعت روئے زمین پر سب سے بڑھ کر راست باز افراد پر مشتمل تھی لیکن چالیس افراد کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غلطی ، کوتاہی اور حبِ مال کی وجہ سے پوری جماعت کو زبردست جانی نقصان اٹھانا پڑا اور جنگ کا پانسہ پلٹ گیا ۔ کیا اللہ تعالیٰ پیغمبرِ خدا اور صحابہ کرام کا مددگار نہ تھا ؟ کیا مخلصین کی اس جماعت پر رحمتِ خداوندی سایہ فگن نہ تھی ؟ اس قسم کے سوالات کا جواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل میں مضمر ہے ۔ آپ ؐ نے جس دانشمندی اور استقلال کے ساتھ بحران کی اس حالت میں اپنی فوج کی کمان کی وہ تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے ۔ آپ ؐ نے حالات کا گہری نظر سے تجزیہ کر کے ہر آنے والے لمحے کو عمل کا لمحہ بنا دیا اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے جب تک اپنی تدبیر ، حکمتِ عملی اور قائدانہ صلاحیت کی بدولت احد میں تیر اندازوں کی غفلت کی تلافی نہیں کی اور کفارِ مکہ کی دست برد سے مدینے کو محفوظ نہیں کر لیا ۔ آپؐ اور آپؐ کے صحابہؓ اُس وقت تک حالتِ جنگ میں رہے جب تک آپؐ کو یقین نہیں ہوگیا کہ کفار لڑائی کا ارادہ ترک کر کے مکہ کی طرف لوٹ رہے ہیں ۔ رسالت مآبؐ کی فراست ، قیادت ، قوتِ ارادی اور سعی و عمل پر یقین کا اندازہ اس طرزِ عمل سے ہوتا ہے جو آپ ؐ نے احد والے دن جنگ کے خاتمے کے بعد اختیار فرمایا ۔ مارٹن لنگز اس طرح منظر کشی کرتے ہیں :

" جب وہ (مسلمان) شہر میں پہنچے تو سورج غروب ہو رہا تھااور جونہی وہ مسجد میں پہنچے انہوں نے مغرب کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آرام کرنے کے لئے لیٹے اور اس قدر گہری نیند سوگئے کہ وہ بلال کی عشاء کی اذان نہ سن سکے اور جب جاگے تو اپنے گھر میں ہی عشاء پڑھ لی ۔ انصاریوں کے سعدین (سعد بن عبادہ اورسعد بن معاذ) اور اوس اور خزرج کے دیگر زعماء ساری رات بابِ مسجد پر پہرہ دیتے رہے کیونکہ قریش کے واپس لوٹنے کا اندیشہ تھا ۔ دوسرے دن نمازِ فجر ادا کرنے کے بعد پیغمبر اسلام نے بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ یہ اعلان کر دے کہ دشمن کا ضرور تعاقب کرنا ہے اور ہمارے ساتھ ان اشخاص کے علاوہ جو کہ کل کے دن جنگ میں ہمارے ساتھ موجود تھے ، کوئی اور ہمارے ساتھ نہیں جائے گا ۔۔۔۔۔۔ اگرچہ احد کے میدان میں مسلمانوں کے کثیر افراد زخموں سے چور تھے ۔ انہوں نے اپنے زخموں پر جہاں تک ممکن تھا مرہم پٹیاں باندھیں اور دوبارہ روانگی کے لئے تیار ہوگئے ۔۔۔۔ پیغمبرِ خدا اگرچہ اپنے داہنے کندھے کو مشکل سے ہلا سکتے تھے سب سے پہلے تیار ہوگئے ۔ جب حضرت طلحہؓ روانگی کا وقت پوچھنے کے لئے آئے تو آپ ؐ اس وقت بابِ مسجد کے قریب گھوڑے پر سوار نظر آئے اور اتنے زخم ان کے جسم پر تھے کہ ان کی آنکھوں کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا ۔ اگرچہ وہ معذور تھے لیکن وہ روانگی کے ارادے سے اپنے گھر چلے گئے۔لشکرِ اسلام نے پہلا پڑاؤ مدینے سے آٹھ میل دور ڈالا ۔ اس وقت دشمن "رواہ" کے مقام پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خیمہ زن تھا جو زیادہ دور نہ تھا ۔ پیغمبرِ اسلام نے اپنے اطاعت گزاروں کو حکم دیا کہ وہ ایک وسیع علاقے میں پھیل جائیں اور زیادہ سے زیادہ لکڑیاں اکٹھی کریں اور ہر شخص اپنے سامنے لکڑیوں کا ایک الگ بنڈل رکھے چنانچہ سورج غروب ہونے تک انہوں نے تقریباً پانچ سو ایندھن کے نمایاں ڈھیر تیار کر لئے اور رات ہوتے ہی ہر شخص نے اپنے ڈھیر کو آگ دکھا دی شعلے دور اور وسیع مقامات سے نظر آتے تھے ایسا لگتا تھا کہ وہاں ایک بہت بڑی فوج خیمہ زن ہے ۔۔۔۔۔۔ کچھ قریشی واپس آ کر مدینہ پر حملہ کرنا چاہتے تھے لیکن انہوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ وہ سبک رفتاری کے ساتھ مکہ روانہ ہو جائیں ۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں نے وہاں سوموار، منگل اور بدھ تین دن اپنے اپنے خیموں میں گذارے اور ہر رات وہ آگ کے الاؤ روشن کرتے تھے ۔ حالانکہ ان دنوں میں ان کو آرام اور نگہداشت کی سخت ضرورت تھی ۔ جمعرات کو وہ مدینہ واپس لوٹ آئے'' (۹)۔

علامہ اقبال قرآن کی تعلیمات اور پیغمبرِ اسلام کی حیاتِ طیبہ کی روشنی سے مستنیر ہوکر اپنے خطبات میں بار بار اس سچائی کو واضح کرتے ہیں کہ اسلام نے دیکھنے، سننے اور غور و فکر کرنے پر بہت زور دیا ہے ۔ گویا اسلام پہلے انسان کو یہ دعوت دیتا ہے کہ وہ اس کائنات کو اپنے حواس خمسہ کے ذریعے دیکھے اور عقل سلیم کی بنیاد پر حیاتِ دنیوی کو خوبصورت، آسودہ، محفوظ اور خوب تر بنائے۔ اس نکتہ نظر سے اقبال سائنسی اصولوں کی روشنی میں عمل اور سعی کی تبلیغ کرتے ہیں ۔ سائنس کی رُو سے کائنات کا نظام علّت و معلول کے سلسلے میں منسلک نظر آتا ہے ۔ سائنس کے نکتہ نظر سے دُعا اور اس کے اثرات کی توجیہہ نہیں کی جا سکتی کیونکہ دعا ایک روحانی عمل ہے جو مادیت سے بالا تر ہے ۔ بندے اور خدا کے تعلق کے معاملے میں سائنس کی رسائی نہیں ہوسکتی ۔اقبال مذہب کے عزائم کو سائنس اور فلسفے سے بلند تر سمجھتے ہیں ۔ امریکن نفسیات دان پروفیسر ولیم جیمز کی اس عبارت کا حوالہ دیتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ دعا انسان کی جبلت میں داخل ہے ۔

'' سائنس کچھ بھی کہے ، مجھے تو یوں نظر آتا ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے ، دعا یا عبادت کا سلسلہ بھی قائم رہے گا ، الا یہ کہ ہم انسانوں کی ذہنی ساخت میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا ہو جائے ، مگر جس کا جہاں تک ہمارے علم کا تعلق ہے امکان نہیں ۔ دراصل دعا کو تحریک ہوتی ہے تو اس لئے کہ اختیارِ نفس انسانی کے اگرچہ کئی مراتب ہیں ، بایں ہمہ اس کی تہوں میں ایک نفس اجتماعی پوشیدہ ہے جسے اپنا سچا ہمدم (رفیق اعلیٰ) کسی مثالی دنیا ہی میں مل سکتا ہے ۔۔۔۔۔ لہٰذا کتنے انسان ہیں جو ہمیشہ نہیں تو اکثر اس ہمدم صادق کی تمنا اپنے سینوں میں لئے پھرتے ہیں اور جس کی بدولت ایک حقیر سا انسان بھی جسے بظاہر لوگوں نے دھتکار رکھا ہو محسوس کرتا ہے کہ اس کی ہستی بھی اپنی جگہ پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کچھ ہے ۔ یہ اندرونی سہارا نہ ہو تو ان حالتوں میں جب ہمارا نفس اجتماعی ناکام ہو کر ہمارا ساتھ چھوڑ دیتا ہے ، دنیا بہتوں کے لئے جہنم بن جائے ۔ میں کہتا ہوں بہتوں کے لئے ، کیونکہ جہاں تک یہ احساس کہ ایک اعلیٰ و ارفع ہستی ہمارے اعمال و افعال کو دیکھ رہی ہے ، بعض لوگوں میں تو بڑا قوی ہوگا ، بعض میں خفیف ۔ گو بعض طبیعتوں کی ساخت ہی ایسی ہے کہ ان میں یہ احساس بہ نسبت دوسروں کے زیادہ شدت کے ساتھ جاگزین ہو ۔ لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ جتنا یہ احساس کسی دل میں قوی ہوگا اتنا ہی مذہب سے اسے زیادہ گہرا لگاؤ ہوگا ۔ لیکن پھر اس کے ساتھ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جو لوگ اس سے انکار کرتے ہیں وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں، کیونکہ تھوڑا ہو یا بہت ، یہ احساس ان کے اندر بھی موجود ہوگا۔(۱۰) "

علامہ اقبال قرآنی آیات کی روشنی میں دعا کی تجلیات کے قائل تھے ۔ وہ اپنے ایک خطبے میں فرماتے ہیں :

" باعتبارِ نفسیات دعا یا عبادت ایک جبلی امر ہے اور پھر جہاں تک حصولِ علم (معرفت) کا تعلق ہے ۔ ہم اسے غور و فکر سے مشابہ ٹھہرائیں گے ۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کا درجہ غور و فکر سے کہیں اونچا ہے مگر پھر غور و تفکر کی طرح وہ بھی تحصیل و اکتساب ہی کا ایک عمل ہے ، جو بحالتِ دعا ایک نقطے پر مرکوز ہو جاتا ہے اور کچھ ایسی طاقت اور قوت حاصل کر لیتا ہے جو فکر محض کو حاصل نہیں۔ فکر کی حالت میں تو ہمارا ذہن حقیقتِ مطلقہ کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس کے اعمال و افعال پر نظر رکھتا ہے لیکن دعا کی صورت میں وہ ایک آہستہ گام کلیت کی منزل بہ منزل راہنمائی کو چھوڑ کر فکر سے آگے بڑھتا اور حقیقتِ مطلقہ پر تصرف حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ یوں بالارادہ اس کی زندگی میں حصہ لے سکے۔۔۔۔۔۔۔۔ دعا بھی ایک حیاتی عمل ہے جس میں ہم دفعتاً محسوس کرتے ہیں کہ ہماری بے نام سی شخصیت کی جگہ بھی کسی بہت بڑی اور وسیع تر زندگی میں ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔

لہٰذا دعا خواہ انفرادی ہو خواہ جتماعی ضمیرِ انسانی کی اس نہایت درجہ پوشیدہ آرزو کی ترجمان ہے کہ کائنات کے ہولناک سکوت میں وہ اپنی پکار کا کوئی جواب سنے ۔ یہ انکشاف و تجسس کا وہ عدیم المثال عمل ہے جس میں طالبِ حقیقت کے لئے نفی ذات ہی کا لمحہ اثباتِ ذات کا لمحہ بن جاتا ہے اور جس میں وہ اپنی قدر و قیمت سے آشنا ہوکر بجا طور پر سمجھتا ہے کہ اس کی حیثیت کائنات کی زندگی میں سچ مچ ایک فعال عنصر کی ہے"(۱۱)۔

دعا کا تعلق مذہب یا نفسیاتِ انسان سے ہے ۔ تاریخِ انسانی یہ بتاتی ہے کہ ہر معاشرے اور ہر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قوم میں دعا مانگنے کا کوئی نہ کوئی تصور ضرور رہا ہے ۔ آج کے سائنسی دور میں اگرچہ کچھ اشخاص اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ دعا سے کچھ حاصل نہیں ہوتا لیکن وہ بھی رواجاً دعا مانگ لیتے ہیں ۔ بحیثیت انسان کبھی اُن کے دل بھی اداس ہوجاتے ہیں اور وہ اپنے دل میں کسی برتر ہستی کے وجود کی روشنی محسوس کرتے ہیں ۔ دعا چاہت و عقیدت کا اظہار ہے ۔ دعا ایک پکار ہے مدد کے لئے ، طلبِ رحمت کے لئے ، توجہ اور التفات کے لئے۔ دعا اپنے حزن و غم کے بیان سے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا نام ہے ۔ دعا کا اصل مقصد یادِ الٰہی اور قربِ الٰہی ہے ۔ بندہ اپنے خدا کے سامنے دست بستہ کھڑا ہوکر اس کی حمد کرتا ہے ۔ اس کی کبریائی بیان کرتا ہے ۔ اس کے سامنے جھک کر اس کی تعظیم بجا لاتا ہے اور سجدہ ریزیوں سے اس کی علوِ شان کا اقرار و اعلان کرتا ہے ۔ یہ سب کچھ حبِ الٰہی کے مظاہر ہیں ۔ بندے اور خدا کے باہمی تعلق کی علامت اور صورتیں ہیں، محبت کا یہ تعلق دو طرفہ ہوتا ہے اور یہی دوستی کا مسلک ہے ۔ جب بندہ اللہ کے اسمائے حسنہ سے اسے پکارتا ہے ۔ اس کی شان ربوبیت کے تصور سے سرشار ہوکر اس کا شکر گذار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس بندے کو یاد کرتا ہے اور یاد رکھتا ہے ۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

فاذکرونی اذکرکم واشکرولی ولا تکفرونO (البقرہ ۲، آیت ۱۵۲)

" پس یاد رکھو تم مجھے ، میں یاد رکھوں گا تمہیں اور شکرگذار بنو میرے اور نہ کرو نا شکری میری"

نماز مکمل اور جامع دعا کی شکل ہے اس لئے ارشاد باری تعالیٰ ہے :

واقم الصلوٰۃ لذکری (طٰہٰ ۲۰، آیت ۱۴)

" اور نماز قائم کرو ، میری یاد کے لئے " ۔

دعا کا یہ مفہوم نہیں کہ عمل سے دست بردار ہو جائیں اور نہ ہی دعا ، بے عملی کا مداوا ہے ۔ نتائج عمل سے پیدا ہوتے ہیں دعا جذبۂ عمل کو ابھارتی ہے،دعا ، اعمال کی کوتاہیوں کو دور کرنے کا عمل ہے ۔ بے عمل انسان کی دعا کی کوئی اہمیت نہیں ہے ۔ علامہ اقبال انسان کے عمل کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ بقول اُن کے کائنات کی ہر شے میں دم خم اور زیب و زینت انسان کے دم قدم سے ہے ۔ انسان کی ان تھک محنت اور جدوجہد سے عالمِ رنگ و بو آباد ہے اور اس میں ہر لمحہ نئی چیزیں معرض وجود میں آرہی ہیں۔ انسان اپنے اندازِ عمل سے نئے جہاں تخلیق کرتا ہے اور زندگی کو نئی تفسیر اور اپنے ارادوں کو نئی تعبیریں بخش رہا ہے ۔اسرارِ خودی میں اپنی نظم " نیابتِ الٰہی " میں فرماتے ہیں :

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زندگی مشہد ز اعجازِ عمل می کند تجدید اندازِ عمل
جلوہ ہا خیزد ز نفسِ پائے او صد کلیم آوارۂ سینائے طور
زندگی را می کند تفسیرِ او میدہد ایں خواب را تعبیر نو

اقبال بنیادی طور پر جہد و عمل اور تجدید عمل کے مفکر ہیں لیکن وہ دعا کے منکر بھی نہیں ہیں ۔ وہ دعا کو قربِ الٰہی ، تقویتِ قلب اور تقویتِ عمل کا باعث سمجھتے ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ بندہ دعا کے تصور کے بغیر اپنی ہستی کو پہچان نہیں سکتا اور عمل کے بغیر مقاماتِ خودی طے نہیں کر سکتا ۔ دعا اور عمل انسان کو لامحدود ہستی کی نو بہ نو تجلیات سے منسلک کرتی ہے ۔ اقبال بندے کی پکار اور خدا کے جواب کو اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر کرتے ہیں خطاب آخر ، اٹھتے ہیں حجاب آخر
احوالِ محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا سوز و تب و تاب اول ۔ سوز و تب و تاب آخر!
میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے شمشیر و سناں اول ، طاؤس و رباب آخر
تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر

اقبال کے مندرجہ بالا اشعار قرآن کی اس آیت کی تفسیر معلوم ہوتے ہیں :

و اذا سالک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی ولیؤمنوا بی لعلھم یرشدونO (البقرہ ۲، آیت ۱۸۶)

" اور جب پوچھیں تم سے میرے بارے میں تو بے شک میں تو قریب ہی ہوں ، جواب دیتا ہوں میں پکارنے والے کی پکار کا، جب پکارتا ہے وہ مجھے ، تو چاہیے کہ وہ مجھے جواب دیں (حکم مانیں میرا) اور یقین رکھیں مجھ پر تا کہ وہ راہِ راست پالیں"۔

حوالہ جات

۱۔ نذیر نیازی سید ، " اقبال کے حضور" ، اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۸۱ء، صفحہ ۳۵۹ تا ۳۶۱

۲۔ اعجاز احمد ، "مظلوم اقبال" ، شیخ شوکت علی پرنٹرز ۱۹۸۵ء، صفحہ ۱۱۷ تا ۱۱۹

۳۔ اقبال محمدؒ شیخ ، " تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" ، مترجم نذیر نیازی ، بزمِ اقبال لاہور ، ۱۹۸۳ء، صفحہ ۱۹۲۔
وضاحت کے لئے ملاحظہ کریں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"Nature is to the Divine Self as Character is to the Human Self"

("*The Reconstruction of Religious Thought in Islam*", *Page 56*)

"Inductive reason, which alone makes man master of his environment, is an achievement; and when once born it must be reinforced by inhibiting the growth of other modes of knowledge."

("*The Reconstruction of Religious Thought in Islam*", *Page 126*)

۴۔ ایضاً، صفحہ ۱۹۳۔۱۹۴۔ اس کا اصل متن یہ ہے :

"Looking at the matter from this point of view, then, the Prophet of Islam seems to stand between the ancient and the modern world. In so far as the source of his revelation is concerned he belongs to the ancient world; in so far as the spirit of his revelation is concerned he belongs to the modern world. In him life discovers other sources of knowledge suitable to its new direction. The birth of Islam, as I hope to be able presently to prove to your satisfaction, is the birth of inductive intellect. In Islam prophecy reaches its perfection in discovering the need of its own abolition. This involves the keen perception that life cannot for ever be kept in leading strings; that in order to achieve full self-consciousness man must finally be thrown back on his own resources. The abolition of priesthood and hereditary kingship in Islam, the constant appeal to reason and experience in the Quran, and the emphasis that it lays on Nature and History as sources of human knowledge, are all different aspects of the same idea of finality. The idea, however, does not mean that mystic experience, which qualitatively does not differ from the experience of the prophet, has now ceased to exist as a vital fact, Indeed the Quran regards both 'Anfus' (self) and 'Afaq' (world) as sources of knowledge."

("*The Reconstruction of Religious Thought in Islam*", *Page 126,127*)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۵۔ کنفیوشس کی تعلیمات کا نچوڑ، Analects کی کتابی شکل میں موجود ہے اس کے انگریزی ترجمہ کو ۱۹۹۷-۲-۹ کو update کیا گیا، اِس کی نقل انٹرنیٹ پر موجود ہے ۔ صفحہ 51 ملاحظہ کیجئے۔

۶۔ عبدالواحد سید معینی، "مقالاتِ اقبال"، آئینہ ادب لاہور، ۱۹۸۸ء، صفحہ ۱۹۷، ۱۹۸

۷۔ صفی الرحمٰن مبارکپوری، "الرحیق المختوم"، دارالکتب السّلفیہ، شیش محل روڈ لاہور، ۱۹۹۸ء صفحہ ۲۹۳ تا ۲۹۶

۸۔ ایضاً، صفحہ ۳۲۷ تا ۳۲۴

۹۔ Martin Lings, "Muhammad", George Allen & Unwin, London, Page195, 196

۱۰۔ اقبال محمد شیخ، "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ"، مترجم نذیر نیازی، بزمِ اقبال لاہور، ۱۹۸۳ء، صفحہ ۱۳۴

"It seems probable that in spite of all that science may do to the contrary, men will continue to pray to the end of time, unless their mental nature changes in a manner which nothing we know should lead us to accept. The impulse to pray is a necessary consequence of the fact that whilst the innermost of the empirical self of a man is a self of the social sort it yet can find its only adequate socius (its "great companion") in an ideal world .... Most men, either continually or occasionally, carry a reference to it in their breasts. The humblest outcast on this earth can feel himself to be real and valid by means of this higher recognition. And, on the other hand, for most of us, a world with no such inner rfuge when the outer social self failed and dropped from us would be the abyss of borror. I say "for most of us," because it is probable that men differ a good deal in the degree in which they are haunted by this sense of an ideal spectator. It is a much more essential part of the consciousness of some men than others. Those who have the most of it are possibly the most religious men. But I am sure that even those who say they are altogether without it deceive themselves, and really have it in some degree."

("The Reconstruction of Religious Thought in Islam", Page 89)

۱۱۔ ایضاً، صفحہ ۱۳۵، ۱۳۶

© rasailojaraid.com